کمال احمد بحیثیت افسانہ نگار

اقلیمہ مہر
اسسٹنٹ پروفیسر
عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا

تلخیص: کمال احمد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جتنی کامیابی کے ساتھ ڈرامے لکھتے ہیں اتنی ہی مہارت کے ساتھ اسٹیج بھی کرتے ہیں اور ان کی یہی خصوصیات انھیں دوسرے ڈرامانگاروں سے الگ کرتی ہے۔ ان کے حوالے سے بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ صرف بنگال کے ہی نہیں ہندستان کے سنجیدہ ڈرامانگاروں میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں

کلیدی الفاظ: کمال احمد، مغربی بنگال، مہارت، مجموعہ، خصوصیات،

کمال احمد کا شمار مغربی بنگال کے معتبر ڈرامانگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنی بصیرت سے اس صنف کو بلندی عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اب تک ان کے ڈراموں کے ۸ (آٹھ) مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے جاچکے ہیں جنہیں لوگوں نے کافی سراہا ہے۔

بہ حیثیت ڈرامانگار کمال احمد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جتنی کامیابی کے ساتھ ڈرامے لکھتے ہیں اتنی ہی مہارت کے ساتھ اسٹیج بھی کرتے ہیں اور ان کی یہی خصوصیات انھیں دوسرے ڈرامانگاروں سے الگ کرتی ہے۔ ان کے حوالے سے بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ صرف بنگال کے ہی نہیں ہندستان کے سنجیدہ ڈرامانگاروں میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں۔

وہ ایک معتبر ڈرامانگار کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "اب تک کی کہانی" ۲۰۲۱ میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ۱۹۹۰ سے لے کر ۲۰۲۰ کے درمیان لکھے گئے کل ۲۷ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے تقریباً تمام افسانے (شیر ازی واحد غیر مطبوعہ افسانہ ہے) ہندستان کے مشہور و معروف اخبارات و جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے افسانے کے مطالعے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ وہ سماج اور اپنے آس پاس کے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں متوسط اور غریب طبقے کی زندگی کی ناہمواریوں، ان کے دکھ درد اور تکالیف کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کا انتخاب اپنے گردوپیش سے کرتے ہیں۔ ان کرداروں کو پیش کرکے ہمیں بھی ان کو سمجھنے اور ان کے دکھ درد کا

حصہ بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ 'انت' میں ایک مزدور (جانی) کی بے کسی و مجبوری اور اس پر ڈھائے گئے مظالم کو بڑی خوبی سے دیکھایا گیا۔ ہمارے سماج کے ان ہزاروں افراد کی طرح جانی بھی اپنی جہالت اور معصومیت کی وجہ سے اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فیکٹری کا مالک اور یونین لیڈر اپنے فائدے کی خاطر قبل از وقت اسے ریٹائر کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے ورکر کی طرح جانی کو بھی ریٹائر منٹ کے بعد ملنے والی رقم سے محروم رہنا پڑتا ہے۔

اس افسانے میں جانی کے بعد اہم کردار، بینک میں کام کرنے والا ایک اسٹاف ہے۔ مہینے کی ہر پہلی تاریخ کو جانی کی ملاقات اس بینک اسٹاف سے ہوتی ہے۔ ایک دن باتوں باتوں میں جانی اپنی تمام پریشانیوں کو بیان کرتا ہے اور مجبور ہو کر اس سے کام مانگتا ہے۔ اس وقت وہ اس کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد بینک میں الیکشن کے وقت غریبوں کے لیے قرض کے کئی منصوبے مرکزی حکومت سے منظور ہو کر آئے تو اسے جانی کی یاد آگئی۔ اس بینک اسٹاف نے کوشش کی کہ جانی کو وہ رقم مل جائے اور اسی غرض سے وہ اس کے گھر جاتا ہے لیکن افسوس اسی دن اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ اور بینک ملازم کو مجبوراً اس کے جنازے میں بھی شامل ہونا پڑتا ہے۔ یہ مکالمہ دیکھیے:

"اس چلچلاتی دھوپ میں کاندھے پر جنازہ کا بوجھ لیے میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں بھی کتنا جلد باز ہوں اگر دو چار دنوں کے بعد ہی جانی کی تلاش میں نکلتا تو کیا مضائقہ تھا اس چلچلاتی دھوپ کی تمازت سے تو بچ جاتا۔ (اب تک کی کہانی، صفحہ نمبر۔۴۹)

بینک افسر کی زبان سے نکلے یہ مکالمے تھوڑی دیر کے لیے ہمیں چونکا دیتے ہیں کہ ہم اسے ایک نیک اور ہمدرد انسان سمجھتے ہیں لیکن اچانک وہ خود غرض بن جاتا ہے۔ دراصل یہ جدید عہد کا وہ کردار ہے جو دوسروں کے لیے کرنا تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن اس کی خود غرضی، مفاد پرستی کب اس کی اچھائیوں پر حاوی ہو جاتی ہے اس کا علم اسے بھی نہیں ہوتا۔ اور یہ ہماری بدلتی تہذیب واقدار کا نتیجہ ہے جہاں انسان اور اس کا اخلاق مسخ ہو گیا ہے۔

افسانہ 'سزاوار' میں حسنہ ایک ایسی بے بس، مجبور خاتون کے روپ میں نظر آتی ہے جس کے پاس گرچہ بارہ کمروں کا مکان ہے لیکن وہ طاقت، صلاحیت اور سپورٹ نہیں جس کی مدد سے وہ اپنے مکان کو سماج کے بے ایمان اور بے حس لوگوں سے بچا سکے۔ جس کے نتیجے میں کلام، پیارو اور سونو جیسے غنڈے نہ صرف یہ کہ اس کے مکان پر غیر قانونی قبضہ جما لیتے ہیں بلکہ اسے بے آبرو کر کے اس کی لاش پر عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ اور ہمارے سماج کے دوسرے افراد محض تماشائی بنے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہمارے سماج میں حسنہ کی طرح بے بس اور مجبور عورت یا مرد کی کمی نہیں ہے۔ انسانی بے کسی و مجبوری کی ایک الگ اور متاثر کن تصویر افسانہ "مادر فروش" اور "اب تک کی کہانی" میں بھی نظر آتی ہے۔ جمیلہ عرف سائرہ "اب تک کی کہانی" کا مرکزی کردار ہے زندگی اپنے طور پر اس سے بھی طرح طرح کی آزمائش لیتی ہے۔

سائرہ کا واحد سہارا یا اس کی دنیا اس کا بیمار بچہ ہے جسے وہ کھونا نہیں چاہتی ہے لیکن وہ تنہا کچھ کر بھی نہیں پاتی ہے وقت اور حالات سے مجبور ہو کر وہ ایک مرد کا سہارا لیتی ہے اور اپنی آبرو تک کا سودا کر لیتی ہے۔ اس کے باجود اس کا بچہ بچ نہیں پاتا ہے۔ لیکن خوش بختی سے اسے ایک ایسے مرد

کا سہارا ملتا ہے جس کے لیے وہ کوئی کال گرل یا طوائف نہیں بلکہ وہ سائرہ کو دل سے چاہتا ہے اس لیے اس کی زندگی کی سچائی کو جاننے کے باوجود کہ وہ ایک بچے کی ماں ہے، وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا لیتا ہے۔

افسانہ ”مادر فروش“ میں مجیدے تنگی رزق کی وجہ سے اپنے گاؤں سے دور دوسرے گاؤں میں زمیندار جگن ناتھ کے پاس مویشیوں کے دیکھ بھال کا کام کرتا ہے۔ وہ یہ کام سولہ سال سے اس جاں فشانی اور محبت سے کرتا ہے کہ جانور اس کے سوا کسی کے ہاتھ سے چارہ نہیں کھاتا۔ حالاں کہ مجیدے کا کام اس کی بیوی رسولن کو پسند نہیں ہوتا۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے شوہر کی طرح اس کا بیٹا فضلو بھی چرواہا بنے بلکہ اس کی خواہش تھی کہ بیٹا مدرسے میں اچھی تعلیم حاصل کرے اور اس کا مستقبل روشن ہو۔ لیکن مجیدے پر زمیندار کا آسیب اس قدر سر چڑھ کر بولتا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ دوسری طرف اسے بھی جانوروں سے اتنی رغبت ہو جاتی ہے کہ وہ بھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ (حالاں کہ مجیدے اپنی فیملی کے ساتھ بہت تکلیف سے گزر بسر کر پاتا ہے لیکن کام نہ ملنے کے خوف سے وہ کہیں اور جانے سے ڈرتا ہے۔) جانوروں سے اس کی محبت کی اس سے بہترین مثال اور کیا دی جا سکتی ہے کہ ایسے وقت میں جب اس کی بیوی پریگننسی کے آخری اسٹیج سے گزر رہی تھی، وہ اپنی بیوی کے بجائے دھنیا (گائے) کا خیال رکھتا ہے کیوں کہ وہ بھی آج کل بچے کو جنم دینے والی تھی۔ مجیدے کا ساتھ دھنیا اور اس کا بچہ کو سلامت رکھتا ہے لیکن صحیح علاج اور ساتھی نہ ہونے کی وجہ سے رسولن اور اس کا نوزائیدہ بچے کی موت ہو جاتی ہے۔ ان کی موت، مجیدے کے لیے ایسی سزا بن جاتی ہے کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتا ہے۔ اب وہ یہی چاہتا کہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے اور اپنے بچے کو اچھی تعلیم و تربیت دے۔ لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور مالک کے حکم کی نافرمانی اسے اس مقام پر لا کھڑا کر دیتی ہے جہاں وہ نہ خود کو بچا پاتا ہے اور نہ اپنے بیٹے کا تحفظ کر پاتا ہے:

”مجیدے نے فضلو کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے بھاگنے لگا...... اچانک اس نے مسجد کی راہ پکڑلی...... مسجد کے قریب پہنچ کر اس نے فضلو کا ہاتھ چھوڑا اور کہا مسجد کے اندر چلا جا...............

اور تم.........بابا

اگر بچ گیا تو گاؤں واپس جاؤں گا...........

بھیڑ اب بہت قریب تھی..........

جا فضلو............جا................

فضلو ڈرتا ہوا مسجد کے احاطے میں داخل ہوا۔ امام صاحب نے اسے اپنی حفاظت میں لیا اور مسجد کا دروازہ بند کر دیا۔

مجیدے نے مڑ کر دیکھا.............

اور اپنی رفتار تیز کر دی.............. (اب تک کی کہانی، صفحہ نمبر ۱۸۲-)

کمال احمد نے جہاں سیدھے سادے افسانے لکھے وہیں علامتی افسانے بھی لکھے۔ ''کاندھے سے ٹکی لاش'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس افسانے کے توسط سے افسانہ نگار نے بڑی ہنر مندی سے انسانی سوچ کے اس مثبت اور منفی پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے جسے اپنا کر ہم اپنی زندگی کو سنوار سکتے ہیں یا سزا بنا سکتے ہیں۔ ایک شخص جو اسپتال کے سرد خانے سے اپنی بیوی کی لاش کاندھے پر ڈال کر بھاگتا ہے تاکہ جلد از جلد لاش سے چھٹکارا پاسکے اور وہ اطمینان سے اپنے آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ سکے جو اسے اکیلے گزارنے تھے۔ لیکن وہ اس لاش کے اکڑ جانے کی وجہ سے سنبھال نہیں پارہا تھا۔ وہ کسی کی مدد لینے کی سوچتا ہے لیکن دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کسی طرح لاش کو لے کر بھاگنے کی سوچتا ہے کہ اچانک تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔ یہ لاش کسی اور کی تو نہیں؟ یا ایسا تو نہیں کہ اس کی بیوی زندہ ہے اور وہ کسی اور کی لاش لے کر بھاگ رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی تصدیق کر لے لیکن اس کی بیوی کو کوئی اور کیسے پہچان سکتا ہے۔ وہ رک کر لاش کو کاندھے سے اتارنا چاہتا ہے پر وہ لاش اس سے جدا ہی نہیں ہوتی۔ وہ بہت خوف زدہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ قبرستان جانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ آس پاس لاش دفن کر دے پر لاش کو خود سے الگ نہیں کر پاتا ہے۔ وہ اپنی بے بسی پر روتا ہے اور پھر اسے اپنی بیوی کی خوبیاں یاد آنے لگتی ہے اور جیسے ہی وہ اس کی خوبیوں کو یاد کرتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ لاش ہلکی ہوگئی اور پھول کی طرح اس کے ہاتھوں میں آگئی۔ یہاں تک کہ لاش سمٹ کر ایک نوزائیدہ بچے کی لاش کی طرح چھوٹی ہوگئی اس لیے اسے زیادہ مٹی بھی کھودنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور وہ لاش کو دفن کر کے گھر چلا جاتا ہے۔ وہاں ایک جانی پہچانی عورت اس سے پوچھتی ہے کہ 'کہاں چلے گئے تھے تم؟ جنازہ کب سے تیار پڑا ہے، اس سے دین مہر معاف کراؤ اور میت اٹھانے کی اجازت دو۔' اور کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کا اختتام قاری کو حیران کر دیتا ہے۔ دراصل افسانے کا کردار (جس کا جدید افسانے کے کردار کی طرح کوئی نام نہیں ہے) خواب دیکھ رہا ہے۔ اور اس افسانے میں لاش کو اچھی اور بری چیز کی علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ جب اس کے دل و دماغ پر negativity حاوی رہتی ہے وہ لاش اس سے چپکی رہتی ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنی بیوی کی خوبیوں کو یاد کرنے لگتا ہے اس کے اندر Positivity آنے لگتی ہے اور وہ لاش پھول کی مانند ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔

اس افسانے کے کردار کے توسط سے افسانہ نگار نے جدید عہد کے فرد کا حقیقی چہرہ دکھایا ہے جو تذبذب و انتشار کا شکار ہے، خود اعتمادی کی کمی ہے اور ذہنی سکون کا متلاشی ہے بلکہ نفسیاتی طور پر اس قدر پریشان ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ وہ کب سویا، کب خواب دیکھا اور کب حقیقی زندگی میں جی رہا ہے۔

کمال احمد کے اہم افسانوں میں ایک ''کفارہ'' ہے۔ جس میں فکر و فن کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔ یوں تو یہ کہانی صدرو اور اس کی بیوی تاجو کی سچی محبت کی داستان ہے۔ ایسی محبت جس کا سلسلہ تاجو کی موت کے بعد بھی نہیں ٹوٹتا۔ لیکن یہ سماج

اور سماج کے افراد غلط رسم ورواج اور اپنے مفاد کی خاطر اس کی موت کو ایک الگ ہی روپ دے دیتے ہے اور ایک نیک اور اچھے ہم سفر کو ایک گناہ گار شوہر بنا دیتے ہیں جس کا کفارہ وہ پوری زندگی ادا کرتا نظر آتا ہے۔

افسانے کا آغاز گاؤں میں قحط کی دردناک اور سنسان رات سے ہوتی ہے جہاں تاجو زندگی اور موت سے لڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاجو اس سے قبل بھی بیمار پڑی تھی اور صدرو چاہتا تھا کہ کھولی بیچ کر ٹاؤن اسپتال میں اس کا اچھا علاج کرائے لیکن ایک ہندستانی اور وفا شعار بیوی کی طرح تاجو بھی اپنی زندگی سے قبل شوہر کی خوشیوں کو ترجیح دیتے ہوئے کھولی بیچنے نہیں دیتی ہے اور بیماری سے لڑتے لڑتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ تاجو کی موت نے صدرو پر وہ اثر کیا گویا خود اس کی روح بھی پرواز کر گئی ہے۔ اس کی موت کے صدمے اور بے بسی کے عالم میں وہ تنہا اپنی بیوی کو نہلا کر، ساڑی میں لپیٹ کر دفن کر دیتا ہے۔ اس کے اسی امر کو گناہ عظیم قرار دیا جاتا ہے۔ گاؤں کے مولوی صاحب کا کہنا ہے:

”............ گناہ عظیم ہے یہ نہایت بے حرمتی ہوئی اس کی............ وہ بدنصیب سہاگن مری اور اسے کفن بھی نصیب نہ ہوا............ قرآن خوانی بھی نہ ہوئی ہو گی............؟

سبھوں نے انکار میں سر ہلایا.............

جنازے کی نمازنہ ہوئی...... تو نہ قل ہو گا، نہ دسواں، نہ بیسواں نہ ہی چہلم......... اس کے گناہوں کی تو بخشائش ہی نہ ہو گی.....

کچھ نہ کرنا ہو گا ورنہ مرحومہ کی روح بھٹکے گی۔“(اب تک کی کہانی، صفحہ نمبر۔۲۰۰)

مولوی صاحب کی باتیں سن کر صدرو سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کی تاجو تو بڑی پاکباز تھی، بخشائش کی اسے کیا ضرورت؟ گناہ ہی کہاں ہوئی ہو گی اس سے............ اور اس کی روح کیسے بھٹک سکتی ہے وہ تو اس کے اندر ہے۔...“. اور صدرو سوچ رہا تھا تاجو کی روح تو اس کے اندر ہے پھر وہ زوروں سے ہنسا اس کی ہنسی سن کر سب چونکے....“(اب تک کی کہانی، صفحہ نمبر۔۲۰۱)

صدرو غم سے نڈھال دیوانوں کی طرح حرکتیں کرتا۔ کبھی ہنستا، کبھی روتا کبھی روتے روتے ہنسنے لگتا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب نے تصدیق کر دی کہ صدرو پر جن سوار ہے۔ انھوں نے اس جن کو قابو میں رکھنے کے لیے تعویذ بھی دیا اور کہا کہ چالیس دنوں تک اس کے گھر میں لوبان جلایا جائے اور لالٹین روشن رکھا جائے۔ دوسری طرف صدرو مولوی صاحب اور اپنے آس پاس کے لوگوں سے پریشان تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن وہ مجبور تھا، کچھ کر نہیں سکتا ہے اس لیے جیسا اسے کہا جاتا وہ ویسا ہی کرتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ صدرو بھی خود کو غم کی دنیا سے نکالنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے خود کو نہیں سنبھالا تو تاجو کی روح کو تکلیف ہو گی۔

گاؤں میں قحط کے بعد سرکاری مدد سے کسانوں نے دوبارہ کام شروع کیا۔ جس میں صدرو بھی شامل ہو گیا۔ ان لوگوں کی محنت ومشقت اور اچھی بارش کی وجہ سے فصل بہت اچھی ہوئی۔ لیکن کسانوں کو اپنی محنت سے زیادہ صدرو کے جن پر اعتماد تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے اچھی فصل کو جن کا کرشمہ سمجھا۔

صدرو اپنی سنبھلتی زندگی میں ایک معمول بنالیتا ہے کہ وہ ہر سال ٹاؤن سے کفن خرید کر کارِ خیر کے لیے مولوی صاحب کو دے دے گا۔ لیکن پانچ سال بعد گاؤں میں پھر قحط کی سی حالت ہو جاتی ہے اور صدرو کا ذہن ماضی کی طرف چلا جاتا ہے۔ وہ گاؤں میں سبھوں کی خیریت دریافت کرتا اور اپنے طور پر ہر کسی کی مدد کرتا ہے۔ وہ اسلام کی بیوی، نوری کے علاج کے لیے رقم بھی دیتا ہے مگر اسلام اس رقم سے اناج خرید لیتا ہے اور نوری بیماری سے لڑتے لڑتے موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی موت سے صدرو بہت غم زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ نوری کی تجہیز و تکفین یہاں تک قل، دسواں، بیسواں اور چہلم کی تمام ذمہ داری لے لیتا ہے اور اسے حسن خوبی سے نبھاتا ہے تاکہ اسے اور اس کی تاجو کی روح کو سکون ملے۔ دوسری طرف گاؤں کے لوگ حیران و پریشان ہیں کہ صدرو کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا کیوں کہ قحط کے وقت پورے گاؤں کو کھلانا معمولی بات نہیں تھی۔ انہیں کچھ دنوں کے بعد پتہ چلتا ہے کہ صدرو نے اپنی کھولی بیچ دی اور چہلم کے بعد کسی نے صدرو کو نہیں دیکھا۔ کہانی کا اختتام کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

"اب اس کھولی میں مولوی صاحب رہتے ہیں۔ کسی نے بتایا صدرو نے وہ کھولی مولوی صاحب کو بیچی تھی تو کوئی بولا بیچی نہیں تھی دے دی اور کئی ایک سے تو یہ بھی کہتے سنا گیا کھولی مولوی صاحب نے لے لی.........واللہ اعلم بالصواب" (اب تک کی کہانی، صفحہ نمبر۔۲۰۱)

کہانی کا اختتام قاری کو دعوت فکر دیتا ہے اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ واقعی صدرو گناہ گار ہے جس کا کفارہ وہ پوری زندگی ادا کرتا ہے یا اصل میں ہمارے سماج کے ایسے مطلب پرست اور خود غرض مولوی خطاوار ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کمال احمد نے اپنے افسانے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جیسے ہماری بدلتی تہذیب واقدار، طوائف اور اسے متعلق مسائل، جدید عہد کی سطحی محبت، انسانی خود غرضی، سیاسی مفاد، معاشی جبر، انسانی بے بسی اور مفلسی وغیرہ۔ وہ الگ الگ موضوع پر افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے چند افسانے موضوعاتی اعتبار سے اتنے منفرد ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد انسان کی زندگی کے ایسے ایسے پہلوؤں یا ایسے ایسے مسائل کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے جہاں ایک عام انسان کی نظر نہیں پہنچ پاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ "افسوس حاصل کا"، "بھری دنیا میں" اور اسقاط وغیرہ۔

"افسوس حاصل کا" مکافاتِ عمل کی عمدہ مثال ہے۔ اس افسانہ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی ہمیشہ ہمارے مطابق نہیں چلتی۔ نہ ہمیشہ زندگی جو نظر آتی ہے وہ ویسی ہی ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ، آج کچھ ہے اور کل کچھ۔ لیکن ان سب میں ایک حقیقت نہیں بدلتی اور

وہ ہے ہمارے اعمال۔ ہم جیسا کرتے ہیں آج نہیں تو کل، یہاں نہیں تو آخرت میں اس کا پھل ضرور پاتے ہیں۔ جیسا کہ بسواناتھ مکھرجی کو اسی دنیا میں اس کے کرموں کا پھل مل جاتا ہے۔

بسواناتھ مکھرجی پولیس محکمے کے اسپیشل برانچ سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ جب تک پولیس محکمے سے وابستہ رہا اس نے ناجائز طریقے سے لاکھوں روپے کمایا، لوگوں پر خوب ظلم وستم بھی کیا، اپنے عہدے کی مدد سے اپنے بچوں کو اچھے اسکول اور کالج میں اعلیٰ تعلیم دلوایا، اسی وردی کا کمال تھا کہ دو بیٹیوں کی شادی بھی اونچے گھرانے میں ہوگئی اور دو بیٹے بھی settled ہوگئے۔ لیکن جیسے ہی بسواناتھ ریٹائرڈ ہوتا ہے، سماج پر اس کا دبدبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب کوئی اس سے ڈرتا ہے اور نہ آؤ بھگت کرتا ہے۔ وہ عمر کے آخری ایام میں اپنی بیوی الکا کے ساتھ رہتا ہے، کوئی اولاد بھی اس کے ساتھ نہیں رہتی۔ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ بیماریوں سے لڑتے لڑتے اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور المیہ یہ ہے کہ موت کے بعد اولاد کے ہاتھوں انتم سنسکار بھی نصیب نہیں ہوتا ہے اور اس کے گھر بار پر غیر کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

افسانہ "بھری دنیا میں" ہمارے سماج کے ایسے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے جس پر ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ آج کے اس جدید دور میں اس کی شرح بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ اس افسانہ میں زرین کے توسط سے ہمارے سماج کی ان لاکھوں لڑکیوں کے دکھ درد کو جاننے کا موقع ملتا ہے جن کی زندگی صحیح وقت پر شادی نہ ہونے کے سبب سے برباد ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ خاندانی تفریق، مذہبی مسلک اور اسٹیٹس ہے۔

زرین کی عمر ۳۵ سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن اس کی شادی صرف اس لیے نہیں ہوئی کیوں کہ اس کے والد دوسرے مسلک میں شادی کے خلاف تھے۔ گرچہ ان کے دونوں بیٹے دوسرے مسلک میں اپنی پسند سے شادی کر کے دوسری جگہ خوشحال زندگی گزار رہے تھے لیکن زرین یہ قدم اٹھا نہیں پاتی ہے۔ اسے بھی زندگی کئی مواقع فراہم کرتی ہے کہ وہ بھی اپنا گھر بسالے لیکن خاندانی وقار، سماج اور مذہب ومسلک کی وہ زنجیر جس سے وہ چھوٹی سی عمر سے بندھی رہتی ہے، توڑ نہیں پاتی۔ والدین کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اس کی زندگی ایک سزا بن جاتی ہے لیکن وہ کسی طرح جینے پر مجبور ہے۔ اس کے والد نے مرتے وقت کہا تھا کہ "تجھے اکیلے چھوڑے جارہا ہوں اس کا افسوس ضرور رہے گا ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا کہ خاندان کی عزت کو بٹا لگے۔"

خاندان کی عزت کی تمام تر ذمہ داریاں زرین کے کاندھوں پر تھی۔ اسے اکثر ایسا لگتا تھا کہ وہ اس زنجیر کو توڑ دے مگر اس کے لیے کبھی ہمت نہیں جٹا سکی۔ لیکن جب اس کے خود غرض بھائی (مظفر اور مظہر) نے اسے جائداد سے بے دخل کرنے کی خاطر راہبہ بننے کا مشورہ دیا تو وہ ہر بندش سے خود کو آزاد کر کے ان کی مخالفت کرتی ہے اور یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ کہیں نہیں جائے گی اور اسے اس کے بھائیوں کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس روز اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے پیروں میں لگی بیڑیاں خود کٹ گئی ہوں۔ اور وہ شاہد کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کی خاطر گھر سے باہر قدم بڑھاتی ہے لیکن اس بار زندگی اس سے یہ موقع چھین لیتی ہے اور وہ پھر کسی اور کا انتظار کرنے لگتی ہے۔

کمال احمد جہاں اپنے افسانوں کے متنوع موضوعات سے قاری کو متاثر کرتے ہیں وہیں کردار نگاری کے ذریعے بھی اپنی فن کارانہ بصیرت کا ثبوت دیتے ہیں۔ صدرو ایک ایسا کردار ہے جو قارئین کے ذہن پر دیرپا اثرات چھوڑتا ہے۔ صدرو کے بعد ان کی کردار نگاری کی اچھی مثال کملا دیوی ہے۔ کملا دیوی افسانہ ”اسقاط“ کا مرکزی کردار ہے۔ وہ پیشے سے ایک دائی ہے۔ اسے اپنے پیشے اور محلے میں رہنے والے لوگوں سے سچی محبت اور جذباتی لگاؤ ہے۔ محلے کے بیشتر بچوں کی پیدائش کملا دیوی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے پلتا بڑھتا دیکھ کر اسے روحانی سکون میسر ہوتا ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دو بچوں کو چھوڑ دیتی ہے (جو شادی کے بعد دوسرے محلے میں چلے جاتے ہیں) لیکن اپنے محلے اور وہاں کے رہنے والوں سے جدا نہیں ہو پاتی۔

ایک دن کملا دیوی کے ہاتھوں مردہ بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ ایک مردہ بچے کی پیدائش کا صدمہ جتنا گہرا والدین کو ہوتا ہے اتنا ہی کملا دیوی کو۔ یہ غم اس وقت مزید بڑھ جاتا جب بچے کے گھر والے مذہبی تفریق کی وجہ سے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جب کہ کملا دیوی کے لیے اس کا پیشہ مذہبی قیود سے آزاد تھا۔ اس روز پہلی بار کملا دیوی کو اپنے بچوں کی بہت یاد آئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنوں کے درمیان نہیں ہے۔ لوگوں کے بدلتے رویے اور اعتماد کی کمی بارہا اس کے وجود کو مجروح کرتا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتی ہے۔ خود پر یقین کرتے ہوئے اپنے کام کو ذمہ داری کے ساتھ کرتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے جب ان کے اعتماد کو بحال ہوتے دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے کہ یہ لوگ اس کے اپنے ہیں جن کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہے، جن کی خوشیوں کی وجہ بنتی ہے اور جن کی خوشیوں میں شامل ہوتی ہے۔

کمال احمد کے کئی افسانوں میں طوائف کو مرکزیت حاصل ہے مثال کے طور پر افسانہ 'ناسور' کی 'سریتا'، 'ہیرا منڈی' کی 'سنیتا' اور بھاسکر بابو کی ”امیت کی ماں“، مصنف نے بہت کامیابی کے ساتھ ان تمام کرداروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو افسانے میں پیش کیا ہے۔ لیکن ان طوائفوں کی الگ الگ زندگی میں ایک حقیقت عام ہے اور وہ یہ کہ وقت اور حالات انہیں طوائف بنا دیتی ہے پر ہر طوائف ایک عام عورت ہے اور ایک عام عورت کی طرح ان کا بھی ایک خواب ہے اور وہ ہے عزت اور آبرو کے ساتھ جینا اور مرنا۔ لیکن ایسی بہت کم طوائف ہوتی ہے جس کا یہ خواب پورا ہوتا ہے کیوں کہ طوائف کا نام ملنے کے بعد ”عزت“ سے ان کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔

کمال احمد کے افسانوں کا اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ کمال احمد چونکہ ایک کامیاب فن کار ہیں اس لیے وہ اسلوب کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے افسانے کا اسلوب بہت سادہ و سلیس ہے۔ وہ روانی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کو لفظوں کا جامہ پہناتے ہیں۔ سرزمین کلکتہ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے اسلوب میں علاقائی اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ کرداروں کی شخصیت کے عین مطابق ان سے کلکتیا انداز میں مکالمے ادا کرواتے ہیں اور برمحل بنگلہ زبان کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ اردو اور بنگلہ زبان کا حسین امتزاج ان کے افسانے کے اسلوب کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ بنگلہ زبان میں ادا کیے گئے مکالمے کی اچھی مثال افسانہ ”دین محمد کی کتھا“ اور ”افسوس حاصل کا“ میں دیکھ سکتے ہیں۔

کمال احمد کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں فکری وفنی سطح پر نکھار نظر آتا ہے۔ لیکن ان افسانے کو لکھنے والے چونکہ ایک بلند پایہ ڈراما نگار کمال احمد ہیں جنھوں نے اپنی برسوں کی محنت، ریاضت، مشاہدہ و تجربہ سے ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ اس لیے توقعات بڑھ جاتی ہیں۔ انہوں نے اچھے افسانے تو لکھے مگر کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جو فکری وفنی سطح پر کمزور ہیں مثال کے طور پر افسانہ 'ڈر، آشوب زدہ' وغیرہ۔ ان افسانوں میں اس گہرائی کا فقدان ہے جو پڑھنے والے کو خود سے باندھ لے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کہانی کو آزاد نہیں چھوڑتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر لمحہ اس کی انگلیاں پکڑے پکڑے ساتھ چلتے ہیں جس کے سبب قاری اتنا ہی جانتا اور سمجھ پاتا ہے جتنا کہ مصنف اسے بتاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے چند کردار بھی ایسے ہیں جن سے ابھی ہم ٹھیک سے متعارف بھی نہیں ہو پاتے کہ وہ او جھل ہو جاتے ہیں۔ صدرو اور کملا دیوی جیسے کردار بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود اس میں کوئی دورائے نہیں کہ کمال احمد نے اپنے اس مجموعے (اب تک کی کہانی) سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک کامیاب ڈراما نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔

☆☆☆

Tareekh- e- Adab- e Urdu
Quarterly Bilingual Interdisciplinary Research Journal
Peer-Reviewed Journal
تاریخ ادب اردو